

ناصر شہزاد کی شعری لفظیات

ناصر محمود۔ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں، یونیورسٹی آف سرگودھا۔
ڈاکٹر سید عامر سہیل۔ صدر شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں، یونیورسٹی آف سرگودھا۔

ABSTRACT:

The right and appropriate selection of words is very important in the diction of poetry. This is historical and literary fact that reiteration of specific words in the diction of a poet affects density of thoughts and aesthetical peculiarity. Nasir Shehzad a contemporary poet belongs to the soil of Punjab uses the words very carefully and impressively. His diction is accommodative with the subject matter of his verses. His words take energy from the soil and culture of Punjab. In this regard the researcher has given a detailed description of his poetry and usage of words in his distinctive diction. The couplets are also quoted from his poetry and the used words are analyzed in their cultural and contemporary political circumstances.

لفظ اُس وقت تک با معنی اور فکری اعتبار سے متحرک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ انسانی فکر کو منسلک نہ کر دیا جائے۔ لفظوں کی یہی معنوی ترتیب ہی کسی تحریر کے با معنی ہونے کا اعلامیہ بن سکتی ہے۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خیال ایک مسلسل اور انسانی حوالے سے ہمہ گیر حقیقت رکھتا ہے، یہ انسان کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر ہے، یہ قدیمی اور دائمی ہے جب کہ لفظ اور بیان کے پیمانے ہر عہد، ہر دور اور ہر علاقے کے حوالے سے نہ صرف مختلف ہوتے ہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی شکلیں تبدیل کرتے رہتے ہیں تاہم لفظ اور خیال ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

”ہر خیال اپنا ماحول، اپنی فضا اور اپنے الفاظ ساتھ لے کر آتا ہے اور اگر اس میں الفاظ کی معمولی

سی تبدیلی بھی کی جائے تو خیال کے ماحول اور فضا دونوں کو دھچکا لگے گا،“ [۱]

زبان اور الفاظ پر قدرت ایک الگ مسئلہ ہے لیکن جب کوئی شاعر، ادیب یا قلم کار ادب کی مجموعی معنیاتی فضا میں کمی محسوس کرتا ہے تو اس کا ذہن نئی معنویت تلاش کرنے اور نئے نئے لفظ ٹٹولنے میں سرگرم ہوتا ہے۔ بلاشبہ نئی معنویت کی افزائش و نگہداشت اور اس کے صحیح تر ابلاغ کے لئے ایک جہانِ نو کی ضرورت ہوتی ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں ہر شاعر یا ادیب کے ہاں مخصوص تہذیبی، ثقافتی یا سماجی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ یہی عوامل فکری صورت میں جب لفظ سے انسلاک کرتے ہیں تو لفظ کی معنویت سامنے آتی ہے۔ ہر بڑا شاعر فکری و معنیاتی فضا کے مطابق نئی

زباں تخلیق کرتا ہے نئے نئے لسانی پیرایے تلاشتا ہے۔ بعض اوقات اس کی جدت طبعِ روایتی و کلاسیکی الفاظ میں بھی ایسا نیارنگ بھر دیتی ہے کہ وہ نئی معنیاتی شان تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

لسانی تشکیلات کے علمبردار بھی اسی رویے کے قائل تھے کہ لفظ کے پُرانے مفہوم کے ساتھ اب سفر کرنا مشکل ہے۔ اس لیے عصری تقاضوں کے مطابق اسے نئے مفہوم کا لباس پہنانا بہت ضروری ہے۔ ناصر شہزاد بھی اسی خیال کے حامی تھے اور انہوں نے اپنی شاعری میں منفرد لسانی تجربے بھی کئے۔ لیکن ان تجربات کی نوعیت، لسانی تشکیلات کے شدت پسند گروہ سے مختلف تھی۔ اس گروہ نے ایک رُحان اور تحریک کو فروغ دینے کے لئے لفظ پر ہر طرح کا تجربہ کیا جس سے شاعری میں کئی کھر درے، کڑوے کیلے، غیر مُذنب، ناشائستہ الفاظ بھی داخل کئے گئے کیونکہ یہ لوگ اپنی جاندار تحریک کے تحت ایک نئے رُحان کے نفاذ کے داعی تھے۔ اس لیے وہ اپنے موقف کی وضاحت کے لئے ہر طرح کے الفاظ کو زبان کا حصہ بنا رہے تھے۔

ناصر شہزاد اس حق میں تھے کہ لفظ کو نئے معنی سے آشنا ہونا چاہیے لیکن وہ زبان کے بنیادی سانچے کو توڑنے کی بجائے اسے نئے الفاظ سے بدلنے کے داعی تھے۔ اس لیے انہوں نے لسانی اجتہاد کیا جو کسی تحریک کے پیروکار کے طور پر نہیں بلکہ اپنی فکری و فنی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے تھا۔ وہ اپنے لئے زبان کا مخصوص پیرایہ چاہتے تھے جس میں صدیوں پُرانے تہذیبی خیالات کو بھی نئے معنی اور مفہوم کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ اس خواہش کا اظہار اُن کے کئی اشعار میں بھی ملتا ہے۔

کرے مسترد جو پُرانے وثیقے

غزل ایسا معجز بیاں مانگتی ہے (بن باس، ص ۱۸۲)

چُن چُن کے کند قافیے لفظوں کی کھپ سے

مت بھر شٹ کر غزل کے نین نقش ریپ سے (بن باس، ص ۵۵۴)

ناصر شہزاد کسی بھی تحریک یا گروہ سے بے نیاز رہے اور آغاز سے ہی اپنی شاعری کو ایک مخصوص لسانی رنگ میں ڈھال دیا اور شعری زباں و بیان میں اپنی انفرادیت کا باقاعدہ اعتراف کیا [۲]۔ ان لسانی تجربات میں انہوں نے زباں کے بنیادی ضابطوں سے تجاوز ہر گز نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں لفظ، نئے مفہام کے ساتھ تہذیب اور شائستگی سے آئے ہیں۔ جسے انہوں نے شعری افکار سے ہم آہنگ کرنے کیلئے پوری پوری ریاضت کی ہے۔ اپنی بات کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ کشٹ اُس سے کرتا رہتا ہے جب کرتا میں کانتا آجائے اور شردھا میں شاننا۔ جب سادھ سپھل ہو، جب شبد کے حصول کا شوق گیان اور نروان کے استھان کو سنبھالے اور شعر کے معانی کو ابلاغ اور اسکی

کہانی کو سہاگ ملے [۳] اپنے اسی نقطہ نظر کی مزید وضاحت یوں کی ہے کہ لفظ کوئی بھی بُرا نہیں ہوتا، صرف اس کو باندھنے کا عمل بُرا ہے۔ [۴]

یعنی دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ لفظ کو اسکے صحیح مفہوم میں باندھا گیا ہے یا نہیں۔ اکثر شعراء پیچیدہ اور ثقیل الفاظ کے استعمال کو فنکاری کی علامت سمجھنے لگتے ہیں اور خیال نہیں رکھتے کہ یہ الفاظ شعر اور غزل کے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ بھی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ محض لفظی انفرادیت رفعت فن کی علامت نہیں ہوتی جب تک وہ فکری و فنی تقاضوں کو ساتھ لے کر نہ چلے۔

ناصر شہزاد نے الفاظ کے رنگارنگ تجربات میں لطیف اور نازک مضامین کو خوش رنگ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے کیونکہ یہ دلکش نظارے برسوں کے قدرتی فطرتی مشاہدے کے سبب اُن کے باطن اور رُوح کی گہرائیوں میں محفوظ تھے جنہوں نے اُن کی شاعری کو ایک میٹھے اور دل آویز اُسلوب کے رُوپ میں ڈھال دیا اور صحیح فنکار جب ایک نیا اُسلوب بناتا ہے تو وہ عجریاں کے سلسلے میں کبھی مورد الزام نہیں ہوگا۔ اُسے اپنے فن اور اُسلوب اظہار پر لامحالہ قدرت ہوگی۔ اس اچھوتے اُسلوب میں اُن کی شعری لفظیات کا جائزہ بہت اہمیت کا حامل ہے تاکہ یہ تعین کیا جاسکے کہ لفظ اُن کے یہاں کس کس انداز سے اور کن کن ذرائع سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

ناصر شہزاد کا مستقل قیام ساہیوال اور اوکاڑہ میں اُن کے آبائی گاؤں شیخو شریف میں رہا۔ وہ پرائمری پاس کر کے ساہیوال پہنچے اور ۱۹۹۶ء میں پھر شیخو شریف مستقل اقامت اختیار کی۔ اور پھر ۲۰۰۷ء تک یہیں قیام رہا یعنی اُن کی شاعری کا بنیادی منظر نامہ انہی شہروں میں ترتیب پاتا ہے یہاں کی فضا، ماحول، مناظر، موسم، ثقافت اور مزاج ان کی شاعری کا بنیادی تخلیقی حوالہ بنتا ہے بڑے شہروں کی ہنگامہ خیز زندگی کی بجائے اُن کے یہاں یہ دو نیم شہری اور نیم دیہاتی مزاج کے حامل شہر ان کو شعری تناظر عطا کرتے ہیں پھر ان شہروں کے مقامی اثرات اور مزاج کو بھی ان کی شاعری میں دخل رہا ہے۔

اوکاڑہ (شیخو شریف) ناصر شہزاد کی جنم بھومی تھا اور پھر انہوں نے برملا اظہار کیا ہے کہ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنی شعری اساس کو اپنے گاؤں کی سادہ اور پگڈنڈیوں سرسوں اور کھیت کھلیانوں سے سچی سنوری زندگی کو بنالیا [۵] جسکی بدولت اُن کے کلام میں اس علاقے کی فضا، مزاج، موسم، رسوم، ثقافت، کھیت کھلیان، مزار، مٹیاں غرض سبھی کچھ نظر آ جاتا ہے۔ انہی تناظرات میں وہ اپنے لئے جو لفظیات چنتے ہیں اُن میں اس علاقے کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ان الفاظ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا خمیر اسی دھرتی سے اُٹھا ہے۔ یہ الفاظ

خالص پنجاب کے دیہاتوں کی یاد دلاتے ہیں اور آگے چل کر یہی مقامی ثقافت اور لفظوں کا مزاج ان کے شعری آہنگ کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ناصر شہزاد کی شاعری میں مقامی ثقافت کے حامل الفاظ کی بحث سے قبل اردو زبان میں مختلف زبانوں کے مدغم ہونے کے عمل سے آشنائی بھی ضروری ہے۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اسکی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس میں ہمیشہ مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہے اور ان الفاظ نے وقت کے ساتھ اس زبان کے نظام میں مستقل جگہ بنالی۔ چنانچہ آج اردو زبان کی جو تصویر ہمیں نظر آتی ہے۔ اس میں مختلف زبانوں کے ان الفاظ کے بے شمار رنگ دکھائی دیتے ہیں اور اگر ان الفاظ کے مختلف رنگوں کو اس تصویر سے نکال دیا جائے تو یہ تصویر ہی باقی نہیں رہے گی۔ اسکی اصل میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہندی بھاشا ہے۔ اس بولی کے افعال پر اسکی بنیاد قائم ہے۔

رنگ سے ڈھنگ تک مختلف میں

مجھ کو اردو سمجھ لو کہ بھاشا (بن باس، ص ۱۳۴)

برصغیر میں تاریخی تبدیلیوں کے نتیجے میں پڑنے والے اثرات کی قبولیت میں اردو نے ہندی اور بھاشا کے ساتھ ساتھ اپنے ارتقائی سفر میں فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی کے بے شمار الفاظ کو بھی اپنے اندر داخل کیا۔ ان کی مخصوص شکلوں کو اپنے مخصوص سانچے میں ڈھال دیا۔ اردو کا مزاج یہ ہے کہ وہ اجنبی اور نامانوس الفاظ کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگتی ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ معلوم نہیں ہوتے بلکہ اردو کے الفاظ بن جاتے ہیں۔ اس کا استعمال، اس کا تلفظ، اس کا رنگ و آہنگ، اسکے قواعد، غرض ہر چیز اردو کے سانچے میں ڈھلی نظر آتی ہے [۶]۔ اس اعتبار سے یہ زبان ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اردو زبان نے اگر ایک طرف علاقائی زبانوں سے مقامی آب و رنگ اپنا کر اپنی زمین سے اپنا رشتہ استوار رکھا تو دوسری طرف فارسی، ہندی، ترکی اور انگریزی زبانوں سے استفادہ کر کے اپنے دامن کو رنگ رنگ تلمیحات اور علامات سے بھر لیا۔

فرسودہ الفاظ اور موضوعات کی توڑ پھوڑ اور شاعری میں نئے الفاظ و موضوعات کے داخلے کا رجحان ہر تخلیق کار کا شیوہ رہا ہے۔ اجتماعی کلچر اور تہذیب کی آمیزش کی بدولت دیگر زبانوں کے اثرات کا در آنا بھی ایک فطری مسئلہ ہے کیونکہ کسی بھی دور میں قومی کلچر اور تہذیب کا کوئی ایسا تصور ممکن نہیں جس میں دیگر قوموں کی تہذیب اور کلچر کی آمیزش نہ ہو۔ ناصر شہزاد نے برصغیر کی اجتماعی تہذیب میں جھانکتے ہوئے ہندی، کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں سے بھی اثرات قبول کئے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو شاعری میں ہندی، عربی، فارسی اور پنجابی الفاظ کے علاوہ انگریزی کے متعدد مقبول عام الفاظ کو ناصر شہزاد نے نگینے بنا کر اردو غزل کا ذائقہ بدل دیا ہے [۷]۔ انہوں نے اپنی

علامتیں اور استعارے منتخب کرتے وقت کسی لسانی، جغرافیائی یا تہذیبی تفریق کو روا نہیں رکھا اور اُن کا استعمال اس سلیقے سے کیا کہ وہ اس زبان میں اجنبی معلوم نہیں ہوتے۔ بقول ڈاکٹر خورشید رضوی:

”اُردو، پنجابی، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی سب زبانوں کے الفاظ اسکے ہاں تخلیق کی آج

سے پگھل کر یوں یکجان ہو جاتے ہیں کہ کسی مغایرت کا احساس تک نہیں ہوتا،“ [۸]

یوں مقامی رنگ و تہذیب کے حامل شعری تناظر کی بدولت پنجاب کی ثقافت کا اُن کی شاعری میں کھلم کھلا اظہار ہے جسکی بدولت پنجابی زبان کے سینکڑوں الفاظ اُن کی شاعری میں جگہ پا گئے ہیں۔ اُنہوں نے اُردو غزل کا دامن پنجابی زبان کے ایسے بنیادی الفاظ سے مالا مال کیا ہے جسکی نظیر اس سے پہلے اُردو غزل میں کم کم ہی ملتی ہے۔

آری صنفِ غزل تجھے سونپیں

یہ انگوٹھی، یہ نتھ، یہ گانی دیکھ (بن باس، ص ۲۳۰)

پنجابی ثقافت کے سارے رنگ اُن کے ہاں رقص کرتے نظر آتے ہیں جس میں گاؤں کی فصلیں، سبزیاں، پھل، خوشبو، کھیت، کھلیان، درخت، چرند، پرند، پہاڑ، دریا، ندیاں، جھرنے، موسم، بانسری کی سُریلی دُھن غرضیکہ شاید ہی کوئی ایسا منظر ہو جو اُن کی آنکھ سے اوجھل رہا ہو۔ یہ سارے منظر اُن کے ہاں جیتے جاگتے اور بولتے دکھائی دیتے ہیں اور انہی مناظر کے بیان نے مقامی زبان کے الفاظ کی بدولت اُن کی شاعری کے کیوس کو وسیع کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

رستے میں کھنڈر، سرکنڈے، بارانی زمینیں

آگے وہ نگر، ارض علاقہ سبھی نہری

رُت سادھ سماجوں کی پلٹ آئی پڑے پھووار

بجلی کے بجے سنکھ، پکے آم دُسہری (بن باس، ص ۲۰۸)

رنگ لٹاتی، رس برساتی، آئی بسنت

آئی بسنت، اٹھلاتی، گاتی آئی بسنت

باغ میں مست پرندے چمکے

سونی چھتوں پر آچل لہکے

دھیان کی بے آباد سبھامیں

پریت کی دُھندلی محل سرا میں

سپنوں کے گھونگھٹ سرکاتی آئی بسنت

آئی بسنت اٹھلاتی گاتی (بن باس، ص ۷۹)

ہندو مسلم تہذیب کے امتزاج میں جہاں موسیقی، مصوری، فن تعمیر میں مشترک منطقے دکھائی دیتے ہیں وہاں ادب میں بھی اسکے اثرات لامحالہ ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ہندی تہذیب کے ٹھہرے پانی میں گرنے والا دوسرا بڑا دھارا تھا جس نے ہندی تہذیب و فکر کو نئے تحرک سے آشنا کیا۔ اس ارتباط کے نتیجے میں ایک نئی تہذیب پروان چڑھی جسے ہندو اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے یہ تہذیب خالصتاً اسلامی ہے نہ ہندی بلکہ اس میں ہر دو اقوام کے مشترک اجزاء ہیں جو باہم اس قدر شیرو شکر ہو چکے ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ ناصر شہزاد نے اسی مشترکہ تہذیبی اختلاط کو اپنی شعری اساس بنایا ہے۔ بچپن میں ہندو دوستوں کے ساتھ، مندروں اور مٹھوں میں جا کر شبد کیرتن چُننے اور اُن کی سُرلی صداؤں کو اپنی سوچ کی مکملی کٹھاؤں سے گزارنے [۹] اور گیت سے روحانی انس نے ناصر شہزاد کو ہندی تہذیب و زبان کی طرف راغب کیا۔ جسکے باعث دیگر زبانوں سے لسانی اشتراک کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کے استعمال کا رجحان اُن کی شاعری میں فراوانی کے ساتھ در آیا۔ ہندی الفاظ کی کثرت نے اُن کی شاعری کو ملتا جلتی ہے [۱۰]۔ اُنہوں نے غزل کی روایت کو ہندی لفظیات کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری کی فضا سے بھی مکمل طور پر آشنا کیا اور اسے ہندی گیتوں کے سانچے میں ڈھالنے کا مفرد تجربہ بھی کیا۔ اوپر سے ہندی الفاظ کی اصوات ہی ایسی ہیں کہ ان کے استعمال سے غزل میں گیت کا آہنگ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ گیت کا یہی آہنگ ناصر شہزاد کو قدیم رومانی روایات کی طرف لے جاتا ہے۔ بقول نظیر صدیقی

”ان کے ذہن میں ہندی شاعری کی رومانی روایات اس حد تک رچ بس گئی ہیں کہ ان کی

شاعری اُردو رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندی شاعری معلوم ہوتی ہے،“ [۱۱]

ناصر شہزاد کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے قدیم ہندی تلمیحات کو نئے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اُن کی جدت پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ اُنہوں نے غزل میں ہندی لہجہ، ہندی بحریں اور ہندی الفاظ نہایت سلیقے سے استعمال کئے۔ اس تجربے کے ساتھ اُنہوں نے مکاحقہ، انصاف کیا اور اسے شعریت کے درجے سے گرنے بھی نہیں دیا [۱۲]۔ اُردو غزل میں ہندی الفاظ کا شامل ہونا ایک مثبت عمل ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُردو غزل بغیر چھان پھٹک کے ہندی کا ہر لفظ قبول کر لے۔ جن لوگوں نے محض فیشن کے طور پر کسی خاص مقصد کی حصول یابی کے لئے ایسا کیا وہ غزل میں کوئی حُسن و خوبی پیدا نہیں کر سکے۔ غزل بنیادی طور پر ایک خوش آہنگ

اور نرم و صنف ہے ایسے الفاظ جو سخت اور ناہموار ہیں وہ اس میں نہیں سما سکتے۔ ہندی بیاں اور لہجے کے دل فریب تجربات سے ناصر شہزاد کی پوری کی پوری غزلیں اور گیت مزین ہیں۔ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

گھنیرے ناریل ندی کنارے
 سجن سجنی سے ملنے کو پدھارے
 گھنیرے ناریل ندی کنارے
 سجنی شام کے ماتھے پہ بندیا
 چرائی جس نے گن وانوں کی نندیا
 پرندے چچائیں ڈالیوں پر
 جگمگ جگنوں منڈیروں جالیوں پر
 پھلا کر پر کہے پنجرے میں مینا
 چند رونتی نے بھوش سُرخ پہنا
 کھلی سرسوں، کھلے لہجے اشارے
 سجن سجنی سے ملنے کو پدھارے

گھنیرے ناریل ندی کنارے (بن باس، ص ۴۰۹)

سیدھے سادے جذبات کو انہوں نے ہندی زبان کے الفاظ اور آہنگ کے سہارے بیان کرنے میں امتیاز حاصل کیا ہے [۱۳]۔ ہندی زبان کیورتارے کے ان تجربات کے ذریعے ناصر شہزاد نے صدیوں پرانی روایات و حکایات کو جب جدید طرز میں پیش کیا تو اردو کے دامن میں الفاظ و خیال کے حوالے سے وسعت پیدا ہوئی۔ ہندی کے قدیم الفاظ کو نئے مفہوم عطا کر کے ان کی اجنبیت کو ختم کیا۔ بقول ناصر شہزاد:

”میں نے اردو زبان کو گھٹایا نہیں بلکہ آگے بڑھایا ہے۔ ہندی الفاظ کے نئے مفہام اور معانی

کے ساتھ میں نے لفظ کو نامانوس نہیں رہنے دیا بلکہ اسی زبان کا ایک حصہ بنادیا ہے،“ [۱۴]

آگے چل کر وہ اپنے اس دعوٰی میں مزید طاقت پیدا کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

”مجھے یہ ادراک ضرور ہے کہ میں نے پورے چالیس سال تک ہندی ڈکشن میں کام کیا ہے میں نے غزل کے خمیر کو گیت کی جاگیر میں تعمیر کیا ہے اور اس کا بدل آپ کو ہندوپاک دونوں ملکوں کے شعراء میں نہیں ملے گا۔ یہ شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ میرے سادھ کی فنی تجلہ ہے،“ [۱۵]

اُن کی شاعری میں ہندی ڈکشن سے برصغیر کی صدیوں پرانی تہذیب کے حالات و واقعات، محبت کے دل فریب تجربے اور اجتماعی تہذیب و ثقافت کے کئی نقوش اجاگر ہو گئے ہیں۔

تجھ سے بچھڑ کے میں نے، سو بار پران تیا گے

کھویا ہوں ریگ زاروں، ڈوبا ہوں آبِ ناؤں (بن باس، ص ۴۵۶)

نت میت.... ریت.... موہ، محبت میں فرض ہے

مت من سے مجھ کو تیاگ یہ بنتی، یہ عرض ہے۔

سودا کیا تھا دل کا، تیرے دل سے اور اب

بن تیرے پران تجنا، مرے سر پہ قرض ہے (بن باس، ص ۴۶۲)

ناصر شہزاد نے اس کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ان کا نام آتے ہی ذہن ہندی الفاظ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے انہیں ہندی زبان پر اس قدر قدرت حاصل ہے کہ جس طرح چاہتے ہیں ہندی الفاظ کو استعمال کر لیتے ہیں [۱۶] وہ شاعری کی وجدانی اور جمالیاتی اقدار سے پوری طرح واقف ہیں اور خوش قسمتی سے وہ ہندی زبان و ادب سے بھی نہ صرف واقف ہیں بلکہ اسکی رُوح کو بھی پہچانتے ہیں اُن کے خیال میں ہندوستانی معاشرت کی صحیح عکاسی صرف ہندی زبان و ادب میں موجود ہے اور اُردو ادب کو ایران عرب کے پنجے سے آزاد کرانے اور اس میں ملکی اور دیسی رنگ و آہنگ پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندی روایتوں سے دل کھول کر استفادہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ معاشرت اور تہذیب ہماری مجموعی تہذیب کا حصہ ہے اسلئے اُن کی شاعری ہندی آب و رنگ سے آراستہ ہے اور ہندی اور اُردو کے ملاپ کا بہترین نمونہ ہے۔

نئی غزل میں جب الفاظ کو کسی خانے میں تقسیم کئے بغیر استعمال کرنے کا رجحان عام ہوا تو اسکی وجہ سے انگریزی کے بہت سارے الفاظ بھی اُردو غزل میں شامل ہو گئے اس کا جواز یہ بھی تھا کہ جو زبان عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو ہمارے لئے ترسیل کا کام کرتی ہے اسے کس طرح شعر و ادب میں نظر انداز کیا جاسکتا ہے انگریز نے برصغیر پر تقریباً ایک صدی کے لگ بھگ حکومت کی ہے طرزِ بود و باش، رہن سہن اور روز مرہ کی بول چال کے حوالے سے

انگریزی زبان و تہذیب نے ہمیں اندرونی اور بیرونی طور پر متاثر کیا ہے۔ اس تغیر و تبدل کا اثر تخلیق کار پر زیادہ پڑتا ہے۔

اُردو زبان نے اگر عرب اور ایرانی فاتحین کے اثرات کو قبول کیا ہے تو یہ انگریزی زبان سے بھی ضرور استفادہ کرے گی کیونکہ انگریز بھی یہاں فاتح کی حیثیت سے رہے ہیں لیکن انگریزی کے ہر طرح کے الفاظ کو برداشت کرنے کی گنجائش اس میں نہیں۔ اُردو زبان کا اعجاز ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے ہر اچھے لفظ کو اپنالیتی ہے اور بُرے کو رد کر دیتی ہے [۱۷]۔ ناصر شہزاد کے ہاں بھی انگریزی الفاظ کا استعمال موجود ہے لیکن اپنی شاعری میں انگریزی الفاظ کے استعمال کی بابت اُن کا یہ دعوٰی محل نظر ہے کہ:

”مجھے یہ دعوٰی ہے کہ انگریزی الفاظ کو اُردو غزل میں سب سے پہلے میں نے رقم طراز

کیا، [۱۸]

اُردو شاعری میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا سلسلہ تو اکبر اور حسرت وغیرہ سے شروع ہو چکا تھا [۱۹]۔ یہ الگ بات کہ ناصر شہزاد نے بھی انگریزی الفاظ کا استعمال بہت مہارت اور عمدگی سے کیا ہے انگریزی کے بعض مروج لفظ بھی ان کے الفاظ کے مرقع میں دسکنے لگے ہیں [۲۰]۔ دیگر زبانوں کے الفاظ کا بر محل استعمال فنی چابکدستی اور مہارت کا متقاضی ہوتا ہے۔

اُردو زبان میں دیگر زبانوں کے استعمال کے وقت زبان و الفاظ کے استعمال کی موجودہ صورت حال اور عصری تقاضوں کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے ہمارے ہاں انگریزی کے لاتعداد الفاظ ایسے بھی ہیں جو روزمرہ کی بول چال کا حصہ ہیں اور جنکے متبادل الفاظ اُردو میں موجود ہیں مگر ان کی جگہ متبادل اُردو کے لفظ آئیں تو بات قدرے الجھ جاتی ہے اور مفہوم کی سمجھ میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ ناصر شہزاد نے اپنی شاعری میں بھی انگریزی کے کئی ایسے لفظ برتے ہیں جو روزمرہ میں اپنے متبادل اُردو کے الفاظ کی نسبت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

جگوں جنموں کی مچھڑی سانوری کو

کلب، دفتر، ملیں، مسلیں، مشینیں

سیاست، ہو ٹلنگ، اخبار، قہوہ

الکھ و دیا کا، دانش کا ستارا

رمق و سکی کی، ایل ایس ڈی کی شکلی

پیالے پروان بھگتی

سڑک، ڈیزل، بسیں ادھ موئے منظر

ترنگیں تیاگ کی، شردھا کی رنگت (بن باس، ص ۳۶۸)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے انگریزی لفظیات کے استعمال کو جہاں ساٹھ کی دہائی کی غزل میں شامل ایک نمایاں رجحان قرار دیا ہے وہاں اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جدت کے شوق میں اکثر شعراء نے اپنی غزلیات میں انگریزی الفاظ کا غیر فنکارانہ اور غیر ہنرمندانہ استعمال کیا جس سے نہ صرف غزل کی رمزیت اور ایمائیت کو نقصان پہنچا بلکہ یہ غزلیات آہنگ کی دلکشی کے باوجود تاثیر سے خالی ہیں انہوں نے ناصر شہزاد کی غزلیات سے بھی کچھ شعری حوالے دیے ہیں [۲۱] ڈاکٹر معین الدین عقیل کے خیال میں بھی ناصر شہزاد کے ہاں انگریزی الفاظ کے استعمال سے آہنگ کے حُسن کے باوجود، غزل کی جاذبیت متاثر ہوئی ہے [۲۲] لیکن ان دونوں حضرات نے اس ضمن میں ناصر شہزاد کے جو شعر درج کئے ہیں وہ اُن کے پہلے شعری مجموعہ ”چاندنی کی پیتاں“ سے ماخوذ ہیں۔ جو اُن کے ابتدائی دور کا کلام ہے۔ بعد ازاں انہوں نے انگریزی الفاظ کو بہت عمدگی سے استعمال کر کے نہ صرف اُردو کا حصہ بنایا ہے۔ بلکہ اسے اپنی غزل کے امتیازی وصف کا درجہ دیا ہے۔ اس ضمن میں ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

”ناصر شہزاد کی غزل کا ایک اور امتیازیہ ہے کہ اُنہوں نے مقامی الفاظ کے علاوہ انگریزی کے وہ

الفاظ بھی برتے جو اب ہماری بول چال کا حصہ ہیں۔ یہ الفاظ اتنے فطری طریق سے آئے ہیں اور

انہیں اس مہارت اور کامیابی سے لایا گیا ہے کہ یہ غزل میں اجنبی لگتے ہیں ناگوار“ [۲۳]

ناصر شہزاد کی غزل میں کئی اشعار ایسے بھی آئے ہیں جن کے ایک ایک شعر میں کئی زبانوں کے الفاظ ایک خاص ترتیب سے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کا استعمال ایسا بر محل ہے کہ شعر کا حُسن متاثر نہیں ہوتا بلکہ ان الفاظ کی آمیزش سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مختلف رنگوں کے نگینوں کو ایک ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

سن کر ملن کا موہنا سندیس فون پر

دل ریچھ ریچھ سا گیا اُس نرم ٹون پر (بن باس، ص ۵۶۷)

ڈائل وہ موبائل پہ کرے ہے مرے نمبر

میج سے وہ بھیجے کئی سندیس..... سنیور

کپڑے پہ ہو گلکاری.... گھنی گوٹہ کناری

پریم کی ہوں پیاری، مجھے پہناؤ وہ تریور (بن باس، ص ۱۲۵)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ ناصر شہزاد نے جہاں مقامی پنجابی ثقافت اور صدیوں پرانی تہذیب کے مزاج اور فضا کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہاں لفظیات کا چناؤ بھی ایسا ہی ہے جو شاعری کی فضا کے عین مطابق ہے ناصر شہزاد کے مقامی اور ارضی شعور کو سمیٹنے کے لئے ان لفظیات کو کھولنا اور سمیٹنا ضروری ہے۔ روایتی لفظیات اور اسکے تلازمات اُن کی شاعری کو سمجھنے کیلئے ناکافی ہیں۔ یہ شعری روایت اپنی الگ شناخت کی حامل ہے اسے روایتی لفظیات و تلازمات کے ساتھ سمجھنے سے بات نہ صرف مبہم ہو جائے گی بلکہ تناظر ہی سے ہٹ جائے گی۔

ناصر شہزاد کی شاعری کی لفظیات کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کی شاعری پنجابی، عربی، انگریزی، ہندی اور مقامی زبانوں کا امتزاج ہے۔ شعری روایت کی تقلید میں ان کے یہاں روایتی لفظ اور تراکیب بھی ملتی ہیں مگر رفتہ رفتہ اُن کی شاعری کا رخ ہندی لفظیات کی طرف زیادہ ہو گیا۔ چونکہ اُن کے یہاں نئے عہد کی نئی جمالیات کی جھلک ملتی ہے اسلئے اس جمالیات کی تشکیل میں انہوں نے مقامی زبانوں اور ہندی سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور یہی اثر اُن کی شاعری کے مناظر میں رنگ بھرتا ہے اُن کی شاعری میں قدیم ہندی روایات اور کمنہ تہذیبی نقشوں سے قلبی وابستگی کی بدولت گیت کا رنگ، گیت کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی غالب صورت میں آیا ہے کیونکہ ہندی زبان کے کثرت استعمال سے لامحالہ گیت کا آہنگ لا شعوری طور پر شاعر کے شعری عمل کا حصہ بن جاتا ہے مختلف تہذیبی زبانوں کا دل فریب استعمال ہی ناصر شہزاد کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔

شدوں کی شکلی بھگتی

میرے اندر سوئی ہے (بن باس، ص ۶۴۵)

مرے ہاتھوں میں حرفوں کی حرارت

مری مٹھی میں لفظوں کے خزینے (پکارتی رہی ہنسی، ص ۱۳۷)

حوالہ جات

- ۱۔ ناصر شہزاد، ”سوال یہ ہے۔ مباحثہ“، اوراق، (نومبر ۱۹۶۸ء): ص ۳۴۔
- ۲۔ ناصر شہزاد، بن باس، ص ۴۱۔
- ۳۔ جاوید باتش، ڈاکٹر، جاگتی آنکھوں کے خواب، (دیباچہ) ناصر شہزاد (ساہیوال: تمثال پبلی کیشنز، نومبر ۲۰۰۲ء)، ص ۱۴۔
- ۴۔ ناصر شہزاد، پکارتی رہی ہنسی، ص ۱۴۔
- ۵۔ ناصر شہزاد، بن باس، ص ۳۷۔
- ۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ”سوال یہ ہے۔ مباحثہ“، اوراق، (نومبر ۱۹۸۶ء): ص ۱۵۔
- ۷۔ انور سدید، ڈاکٹر ”بن باسی“، ماہنامہ تخلیق، (فروری ۲۰۰۸ء): ص ۸۱۔
- ۸۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، ”ناصر شہزاد۔ ایک منفرد شاعر“، ص ۱۸۳۔
- ۹۔ ناصر شہزاد، بن باس، ص ۳۵۔
- ۱۰۔ محمد امین، ڈاکٹر، ”ناصر شہزاد کا بن باس“، ص ۱۸۹۔
- ۱۱۔ نظیر صدیقی، جدید اردو غزل۔ ایک مطالعہ (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۴ء)، ص ۵۵۔
- ۱۲۔ تقدیس زہرا، ڈاکٹر، بیسویں صدی کی اردو شاعری میں اساطیری عناصر (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۹۱۔
- ۱۳۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، پاکستانی غزل، تشکیلی دور کے رویے اور رجحانات (کراچی: ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۰۷۔
- ۱۴۔ ناصر شہزاد، خط بنام اطہر جاوید (مدیر)، (مطبوعہ) ماہنامہ ”تخلیق“، (اگست ۱۹۹۹ء): ص ۱۳۷۔
- ۱۵۔ ناصر شہزاد، خط بنام نصیر احمد ناصر (مدیر)، (مطبوعہ) سہ ماہی تسطیر، (اکتوبر ۲۰۰۱ء): ص ۳۳۹۔
- ۱۶۔ سرور الہدی، نئی اردو غزل (دہلی: معیار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۶۸۔
- ۱۷۔ ناصر شہزاد، ”سوال یہ ہے۔ مباحثہ“، ص ۳۷۔
- ۱۸۔ ناصر شہزاد، بن باس، ص ۳۸۔
- ۱۹۔ سرور الہدی، نئی اردو غزل، ص ۱۷۸۔
- ۲۰۔ مجید امجد، ”طوفانوں میں ایک موج۔ ناصر شہزاد“، سہ ماہی صوتِ ہادی، (جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء): ص ۲۷۔

- ۲۱۔ ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اُردو غزل کا تکنیکی، ہنسیتی اور عروضی سفر (لاہور: مجلس ترقی ادب، اگست ۲۰۰۸ء)، ص ۲۴۲۔
- ۲۲۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، پاکستانی غزل، تشکیلی دور کے روئے اور رجحانات، ص ۱۰۸۔
- ۲۳۔ ناصر عباس نیو، ڈاکٹر، ”بن باس پر ایک نظر“، ص ۷۹۔